پروفیسر خالد شبیر احمد قسط:۲۶

ورق ورق زندگی

لاہور سے واپسی:

لاہور میں قیام کا مرحلہ بھی گزر گیا۔ اس عرصے میں اگرچہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم اچھے دوستوں کی رونق میں نے اپنے اردگرد جمع کر لی تھی جس کی وجہ سے ان مشکلات کے باوجود میں نے کسی لمحے یہ نہیں سوچا کہ میں ان مشکلات کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بلکہ ہر مشکل میں، اپنے آپ سے یہی کہتا رہا۔

عزائم اپنے بلند رکھنا ہر ایک مشکل میں ابتلا میں
تم اپنی ٹھوکر پہ ہر طرح کی مصیبتوں کا عتاب رکھنا
مُہیب راتوں میں ہولے ہولے سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانا
لہو سے اپنے دیا جلا کے جنوں کے روشن نصاب رکھنا
وہ جس کی خاطر چلے تھے گھر سے اُسی پہ رکھنا نگاہ اپنی
وہی ہے خالدؔ وفا کی منزل نظر میں اپنی وہ خواب رکھنا

ایم۔اے بھی کیا اور ہاکی بھی خوب کھیلی۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے لیے پنجاب یونیورسٹی ہاکی ''چیمپیئن شپ'' جیت کر دی جو کہ کالج کا بہت بڑا اعزاز تھا۔ اس پر گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل پروفیسر سراج اور ہمارے ہاکی ٹیم کے انچارج ڈاکٹر نذیر دونوں نے ہمیں گلے لگا کر داد دی اور کہا کہ ایک عرصے سے ہماری یہ خواہش کہ پنجاب کی چیمپیئن شپ ہم جیتیں، آپ نے پوری کر دی۔ ہم پچھلے دس برسوں سے اسلامیہ کالج سے ہارتے آ رہے تھے، آپ نے اُنہیں ہرا کر جو اعزاز اپنے کالج کے لیے حاصل کیا ہے اُس پر ہمیں ناز ہے۔ اس کے علاوہ میں لاہور ڈسٹرکٹ کی ٹیم کے لیے بھی چُن لیا گیا تھا اور پھر لاہور ڈویژن کے لیے بھی۔ لیکن میں نے لاہور ڈویژن کی ہاکی ٹیم کی تربیت کے لیے کیمپ میں شمولیت اختیار نہ کی کہ امتحان سر پر تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھے توقع تھی کہ میں لاہور ڈویژن کی ہاکی ٹیم کی طرف سے نیشنل ہاکی چیمپیئن شپ میں شمولیت اختیار کرتا۔ جس کے بعد شاید مجھے پاکستان ہاکی ٹیم میں شمولیت کا موقع مل جاتا۔ تاہم لاہور کے قیام سے میں خوش تھا کہ نامساعد حالات میں ایم۔اے کا امتحان پاس کر لیا اور امتحان کے بعد واپس اپنے گھر فیصل آباد آ گیا۔ اب میرے اعتماد، میرے عزم اور نصب العین کے حصول کے لیے محبت سے کام لینے کے جذبے میں گراں قدر اضافہ ہو چکا تھا۔

ہر موجِ حوادث ہے میرے عزم کو مہمیز
ساحل نظر آتا ہے مجھے اپنا بھنور میں

کی مصداق ہو چکا تھا۔

نوکری کی تلاش میں کامیابی:

۱۹۵۸ء میں شادی ہوئی، ۱۹۵۹ء میں ایم۔اے کا امتحان پاس کیا اور تھوڑی سی محنت وتلاش کے بعد ۱۹۵۹ء میں ہی مجھے چک ۳۳۔گ،ب پیر محل کے ساتھ ایک گاؤں کے سکول جسے اب کالج بنا دیا گیا تھا، میں سوکس پڑھانے لیے بطور لیکچرر ملازمت بھی مل گئی۔ یہ کوئی با قاعدہ کالج نہیں تھا۔نویں دسویں کو ساتھ ملا کے گیارہویں جماعت شروع کی گئی تھی۔ قاضی عطاء اللہ جو کہ ایک مدت سے اس گاؤں کے سکول کے ہیڈ ماسٹر رہے تھے اُنھی کو اس کالج کا پرنسپل بنا دیا گیا۔جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ انہوں نے کہیں گڑھ یونیورسٹی سے تاریخ میں ایم۔اے کیا ہوا تھا۔ایک سال تک اس گاؤں کے سکول سے کالج بننے والے کالج میں ملازمت کی لیکن عجیب وغریب حالات میں۔پہلی بات تو یہ تھی یہ گاؤں تھا اور گاؤں کا ماحول اس قابل نہیں تھا کہ یہاں پر کالج قائم کیا جاتا۔کالج کے لیے جس ماحول کی ضرورت ہوتی ہے وہ ماحول کسی بھی حوالے سے یہاں پر میسر نہیں تھا۔کالج کے لیے مختلف مضامین کے لیے جتنے بھی لیکچرر بھرتی کیے گئے اُن تمام کو اس گاؤں کے ایک مکان میں ٹھہرایا گیا۔گاؤں والوں کو ہمارا اُن کے گاؤں میں ٹھہرنا پسند نہیں تھا وہ بجائے اس کے کہ ہمیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے اُلٹا ہم پر اعتراض کرنے لگے کہ یہ لوگ روزانہ نہاتے کیوں ہیں۔ پینٹ کوٹ کیوں پہنتے ہیں۔ٹائی کیوں لگاتے ہیں۔ ہمارے گاؤں کا ماحول انہوں نے تباہ کر دیا ہے۔اس پر ہم ان سے بچنے کے لیے گاؤں سے سکول کے ہوسٹل جو کہ کالج سے باہر تھا وہاں سکونت اختیار کی تو دم میں دم آیا اور کچھ چین نصیب ہوا۔لیکن یہاں پر بھی کئی قسم کے مسائل تھے جن کا ہمیں مقابلہ کرنا پڑا۔

ڈاکٹر فرید:

دراصل یہ کالج اس گاؤں کے ایک معمر ڈاکٹر فرید کی انتھک محنت کا نتیجہ تھا۔ وہ اس گاؤں میں ایک کالج بنانا چاہتے تھے اور یہ اس کا پہلا سال تھا۔ڈاکٹر فرید جو کہ پورے ملک کے میں سرسید آف پاکستان کے نام سے مشہور ہو چکا تھا نے پاکستان کے باہر سے اچھا خاصا پیسہ اکٹھا کر لیا تھا۔جس سے وہ سارا سامان جو کہ ایف۔ایس۔سی میڈیکل اور نان میڈیکل کے تجربات میں استعمال ہوتا ہے اسے ان سے حاصل کر لیا تھا۔وہ گاؤں کے میں ایک ایسا تعلیمی ادارہ بنانا چاہتا تھا جو آگے چل کر یونیورسٹی بن جائے۔اس کام کے لیے وہ اس وقت کے پاکستان کے صدر ایوب خان سے بھی دو دفعہ مل چکے تھے اور انہیں امیر المؤمنین کہہ کر اُن سے بھی تقریباً ۵۰ ہزار روپیہ اس کام کے لیے حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو چکے تھے۔اور یہ سب کچھ اُن کی اُس خیالی یونیورسٹی کا نقطۂ آغاز تھا جس کا ہم شکار ہوئے۔

جس شخص کو کالج پرنسپل بنایا گیا اُسے کسی کالج میں کام کرنے کا سرے سے کوئی تجربہ نہیں تھا۔اور ستم بالائے ستم یہ کہ وہ قادیانی تھا اور مجھے اس نے کالج کا ''چیف پراکٹر'' بنا دیا۔اب آپ خود اندازہ لگالیں کہ میری اُن کے ساتھ کیسے نبھ

پاتی۔ میں کالج ڈسپلن کو برقرار رکھنے کے لیے جو بھی کام کرتا پرنسپل صاحب اُسے پسند فرماتے، جس لڑکے کو فائن کرتا اُسے یہ کہہ کر معاف کر دیتے کہ یہ لڑکا تو اس انجمن کے رکن کا بیٹا ہے جو انجمن اس کالج کو چلا رہی ہے۔

ناصر شمسی کی آمد اور پرنسپل صاحب کے ساتھ اختلافات:

اس وقت میں بڑا خوش ہوا جب میرے یونیورسٹی کے دوست ناصر شمسی بھی اس کالج میں انگریزی پڑھانے کے لیے مجھ سے آن ملے۔ ہم ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ اور ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک دوسرے کے حوصلے بلند کرتے رہے لیکن مسائل تھے کہ ختم ہی نہیں ہوتے تھے۔

پرنسپل قاضی عطاء اللہ عجیب وغریب شخصیت تھی۔ مجھے ایک دن اپنے دفتر میں بلایا اور کہا کہ دیکھو میں نے یہ انگلینڈ سے ''ڈیوک آف اڈنبرا'' اور ملکہ الزبتھ کی قد آور تصویریں منگوائی ہیں۔ میں نے دیکھا تو واقعی ان کی بڑی خوب صورت تصویریں اُن کے دفتر میں پڑی ہوئی تھیں۔ کہنے لگے آپ کا کیا خیال ہے یہ تصویریں کالج ہال میں نہ لگوادوں؟

میں نے کہا کہ وہ کس لیے۔ کہنے لگے کہ بہت ہی خوبصورت ہیں۔ دیکھو نا یہ ملکہ الزبتھ کتنی خوبصورت ہے۔ میں نے کہا کہ پھر ''کم ناوق'' جو کہ ہالی وڈ کی ایک مشہور ایکٹریس تھی اُس کی تصویر لگوالو کہ وہ تو اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ کہنے لگے کیا حرج ہے میں تو کالج ہال میں یہ تصویریں لگوا رہا ہوں اور پھر اُس نے وہ دونوں تصویریں کالج ہال میں لگوا دیں۔ میں اُس کی اس جسارت پر حیران بھی تھا اور پریشان بھی کہ اس نے تو میرے لیے ایک امتحان کی صورت پیدا کر دی ہے۔ ایک احراری کیسے برداشت کرلے کہ وہ ان لوگوں کی تصویریں ایک تعلیمی ادارے کے ہال میں رہنے دے جن کے اسلاف کے خلاف ہمارے اسلاف جنگ آزادی لڑتے رہے ہوں۔ میں نے اس سلسلے میں ناصر شمسی سے بات کی تو اس نے کہا کہ موقع کا انتظار کرو ان شاء اللہ کوئی صورت بن جائے گی اور تمہاری یہ خواہش پوری ہو جائے گی۔ لیکن مجھے چین کہاں۔ میں تو دن رات یہی سوچتا کہ کیا کروں۔ کالج میں سٹرائیک کی کوشش کی تو مجھے کامیابی نہ ہوئی۔ آخر کار مجھے موقع مل گیا۔ کالج میں ایک تقریب تھی اور مجھے اس سے خطاب کرنے کے لیے کہا گیا۔ تقریب کیا تھی اور مجھے کیا تقریر کرنا تھی اس کا تو مجھے کچھ احساس نہ رہا۔ میں شروع ہو گیا۔ جنگ آزادی میں اسلاف کی قربانیاں بیان کرنے اور پھر میں نے انگریزوں کے دجل وفریب، انگریزوں کے جبر واستبداد جو آزادی کا مطالبہ کرنے والوں پر کیے گئے تھے اور پھر مسئلہ کشمیر اور پاکستان کے خلاف جو کچھ انگریزوں نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر کیا وہ سب کچھ بیان کر کے میں نے جب دیکھا کہ اب مجمع میرے کنٹرول میں ہے تو پھر میں نے کہا کہ:

''دیکھیے ہمارے پرنسپل صاحب بھی کتنے بھولے بھالے ہیں ملکہ اور اس کے خاوند کی تصویریں انہوں نے کالج ہال میں لگوادی ہیں۔ انہیں اگر کسی غیر مسلم کی تصویر لگوانی ہی تھی تو کسی مشہور سائنس دان کی لگواتے اور پھر کسی علمی شخصیت کی تصویر لگواتے۔ کالج ہال میں صدر ایوب کی تصویر تو نہیں ہے جس سے ڈاکٹر فرید صاحب کالج کے لیے پچاس ہزار کی رقم

لے کر آئے ہیں اور یہاں پر ملکہ انگلستان کی تصویر لگی ہی ہوئی ہے۔ جنہوں نے ہمیں ایک سو سال تک غلام بنائے رکھا۔‘‘

اس پر میں نے لڑکوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ کیا یہ تصویریں کالج ہال میں لگی رہنی چاہئیں یا پھر انہیں اُتار دینا چاہیے، لڑکے تو میری مٹھی میں تھے اُنہوں نے کہا کہ نہیں یہ تصویریں اتار دینی چاہئیں۔ پرنسپل صاحب نے جب یہ دیکھا کہ معاملہ خراب ہو رہا ہے تو کہنے لگے کہ ہاں میں تصویریں اُتار دوں گا۔ میں نے جواباً کہا کہ نہیں آپ کے حکم کے مطابق یہ خدمت میں سرانجام دوں گا۔ کہنے لگے اُتار دو، چنانچہ جلسہ ختم ہو گیا اور میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کالج ہال میں گیا اور وہ تصویریں اُتار کر پرنسپل صاحب کو دیں اور ساتھ ہی کہا کہ یہ تصویریں آپ اپنے گھر میں اپنی خواب گاہ میں لگوا دیں تو آپ کے لیے زیادہ بہتر ثابت ہوں گی۔

پرنسپل صاحب کے جوابی وار:

ظاہر ہے کہ میری اس جسارت کو پرنسپل صاحب نے اپنی اہانت سمجھا اور مجھے تنگ کرنے کے لیے ایک ایسی منصوبہ بندی کی کہ میں تنگ آ کر اُن کے سامنے گھٹنے ٹیک دوں لیکن یہ اُن کی خام خیالی تھی۔ انہوں نے مجھے ایک دن دفتر میں بلایا کہ آپ صرف ایک پیریڈ سوکس کا پڑھاتے ہیں اور اس کے بعد سارا دن عیش کرتے رہتے ہیں۔ لہٰذا کل سے آپ نویں جماعت کو اردو پڑھائیں گے۔ میں نے حامی بھر لی اور نویں جماعت کو میں نے سوکس کے علاوہ اردو پڑھانا شروع کر دی۔ ابھی دس بارہ دن ہی گزرے تھے کہ پھر مجھے اپنے آفس میں طلب کیا اور کہا کہ اب آپ ایسا کریں کہ نویں جماعت کو اردو پڑھانے کی بجائے آپ دسویں جماعت کو ہسٹری (تاریخ) پڑھائیں۔ میں نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے دسویں جماعت کو ہسٹری پڑھانا شروع کر دی، پھر دس روز کے بعد مجھے اپنے دفتر طلب کر کے کہنے لگے کہ آپ فرسٹ ائیر کو انگلش گرامر پڑھانا شروع کر دیں اور دسویں جماعت کو تاریخ پڑھانا چھوڑ دیں۔ میں نے فرسٹ ائیر کو انگریزی پڑھانا شروع کر دی تو پھر آٹھ دس دن کے بعد مجھے اپنے دفتر میں بلوایا کہ آپ ایسا کریں کہ نویں جماعت کو اردو پڑھائیں۔ کل میرے پاس نویں جماعت کے طالب علم آئے تھے اور وہ کہہ رہے تھے کہ پروفیسر خالد شبیر احمد اردو اچھا پڑھاتے ہیں اس لیے کل سے آپ انہیں اردو پڑھائیں گے۔ میں نے جواب میں کہا کہ ’’میں کل سے انہیں اردو پڑھانے سے انکار کرتا ہوں اب تو میں فسٹ ائیر کو انگلش گرامر ہی پڑھاؤں گا۔‘‘

میرا یہ جواب سن کر وہ کچھ غصے میں آ گئے اور کہنے لگے کہ تم یہ کیا کہہ رہے ہو۔ میں نے کہا میں جو کچھ کہہ رہا ہو وہ بالکل واضح ہے۔ آپ مجھے یہ تاثر کیوں دے رہے ہیں کہ جو کام مجھے آپ دیتے ہیں وہ محض ’’کام چلاؤ کام‘‘ ہے۔ میں ان کا کوئی ذمہ دار نہیں ہوں کہ کل کوئی اور کام مجھے دے دیا جائے گا۔ آپ مجھے ایک کام دیں اور مجھے پابند کریں کہ میں اس کا ذمہ دار رہوں۔ میں کام سے نہیں گھبراتا لیکن کام لینے کا یہ طریقہ غلط ہے اور آپ کے علم میں یہ بات ہونی چاہیے کہ میں نہ خود غلط کام کرتا ہوں نہ کسی اور کو غلط کام کرنے دیتا ہوں خواہ وہ پرنسپل ہی کیوں نہ ہو۔ یہ جواب سن کر وہ خاموش ہو گئے اور کہنے

لگے کہ اچھا تم فرسٹ ائیر کو انگریزی گرامر پڑھاؤ۔

ایک جرم پر ایکشن لینے سے انکار اور ہڑتال:

اسی دوران کالج ہوسٹل میں ایک لڑکے کے کمرے سے شراب برآمد ہوئی۔ تمام پروفیسروں نے اس پر احتجاج کیا اور مجھے کہا کہ تم بطور کالج چیف پراکٹر اس کے خلاف ایکشن لو۔ میں نے پرنسپل صاحب کو اس جرم پر لڑکے کو کالج سے نکالنے کے لیے کہا۔ اس وقت میرے ساتھ کالج سٹاف کے تمام پروفیسر بھی تھے۔ پرنسپل صاحب نے وہی پرانی بات دہرا دی کہ یہ لڑکا تو کالج کی انجمن کے ایک رکن کا بیٹا ہے۔ ہم نے کہا کہ پھر کیا ہے؟ پرنسپل صاحب نے ہماری بات ماننے سے انکار کر دیا۔ جس کے جواب میں ہم تمام پروفیسروں نے ہڑتال کر دی اور غالباً جہاں تک مجھے یاد ہے لڑکے کو سکول سے دوسرے سکول مائی گریشن پر مجبور کر دیا گیا۔ اور یہ معاملہ اس طرح حل ہو گیا۔

ڈاکٹر فرید کے نواسے کے خلاف ایکشن:

کالج میں کوئی ایک مسئلہ تو تھا نہیں بلکہ یہ تو کالج آف مسائل تھا۔ ڈاکٹر فرید کے نام کی نہ صرف کالج بلکہ اردگرد کے دیہاتوں میں رعب اور دہشت کے ساتھ ساتھ احترام بھی تھا۔ اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کا ایک نواسہ کالج کے ہر پروفیسر سے گستاخی کرتا تھا اور کوئی اسے روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ ایک دن اس لڑکے نے سکول کے پی۔ ٹی ماسٹر کو نہ صرف گالیاں دیں بلکہ اسے مارا بھی۔ میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور سوچتا تھا کہ کسی روز خدا مجھے موقع دے تو اس لڑکے خلاف کارروائی کی جائے۔ سارے پروفیسر اس لڑکے کے طرز عمل سے نالاں تو ضرور تھے لیکن کسی میں ہمت نہیں تھی کہ اس کے خلاف محض شکایت ہی پرنسپل صاحب کو کر دیتے۔ ایک دن کیا ہوا کہ رمضان المبارک کے مہینے میں کالج میں یوم علی رضی اللہ عنہ کی تقریب تھی۔ اور یہ لڑکا (ڈاکٹر فرید کا نواسہ) اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ہال میں داخل ہوا تو اس نے ہلڑ بازی شروع کر دی اور ایسے حالات پیدا کر دیے کہ تقریب کا جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور اسے گردن سے پکڑ کر ہال سے باہر دھکیل دیا دس روپے جرمانہ کی سزا کا اعلان بھی کر دیا۔ اس پر لڑکا تو غصے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر چلا گیا، تقریب ختم ہوئی تو پرنسپل صاحب نے سٹاف میٹنگ بلوالی کہ خالد شبیر نے ڈاکٹر صاحب کے نواسے کو سزا دی ہے اور ابھی ڈاکٹر صاحب یہاں آئیں گے تو ان کے غصے کا ہمارے پاس کیا جواب ہوگا۔ میرے ساتھ والی کرسی پر میرے دوست ناصر شمسی بیٹھے تھے۔ مجھے کہنے لگے کہ اب کیا ہوگا؟ میں نے کہا جو ہوگا دیکھا جائے گا میں نے سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا۔ اچانک ڈاکٹر فرید صاحب مع اس نواسے کے کالج کے پرنسپل کے دفتر کے دروازے پر آ کے رک گئے، نواسہ اُن کے ساتھ ہی تھا اندر داخل نہیں ہوئے دروازے پر کھڑے ہو کر غصے میں کہا کہ ''اس بچے کا قصور'' سب خاموش تھے۔ کوئی بول نہیں رہا تھا کہ اتنے میں ڈاکٹر فرید نے مزید بلند آواز سے پرنسپل صاحب کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''میں پوچھتا ہوں اس بچے کا قصور''

پرنسپل صاحب نے جواباً کہا کہ آیئے ڈاکٹر صاحب اس کا قصور آپ کو خالد شبیر صاحب بتائیں گے۔ اس وقت تک میرے ذہن کے کسی گوشے میں اس کا جواب نہیں تھا۔ لیکن میں بڑے اعتماد اور اطمینان سے اپنی کرسی سے اٹھا۔ اٹھ کر ڈاکٹر فرید صاحب کا ہاتھ پکڑا اور اُن سے کہا کہ آیئے اس کا قصور میں آپ کو بتاتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کو اپنی ساتھ والی کرسی پر بٹھالیا۔ سارے پروفیسر میری طرف دیکھ رہے تھے اور پورے دفتر میں سناٹا تھا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو کہا کہ:

''ڈاکٹر صاحب اس بچے کا قصور یہ ہے کہ یہ آپ کا نواسہ اس کالج جو اس عمر میں آپ دن رات ایک کر کے بڑی محنت سے بنا رہے ہیں اور جس نے ایک روز آپ کے پروگرام کے مطابق ایک منفرد یونیورسٹی بن جانا ہے یہ آپ کا لڑکا اسے تباہ کرنا چاہتا ہے اور میں اسے تباہ نہیں ہونے دوں گا۔''

یہ کوئی سوچی سمجھی بات نہیں تھی فوری طور پر میرے ذہن میں آ گئی اور اللہ نے مجھ سے کہلوا دی تھی۔ مجھے اس بات کا احساس ضرور تھا کہ یہ کالج ڈاکٹر صاحب کی بہت کمزوری ہے اور شاید یہ بات اُن پر اثر کرے اور اس سے کوئی بھلائی کا پہلو نکل آئے۔ میری اس بات کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے کہا:

''میرے اس کالج کو کون تباہ کر سکتا ہے اور کیسے تباہ کر سکتا ہے''

میں نے جواب میں کہا:

''یہ لڑکا اس کالج کے تمام پروفیسروں کے ساتھ گستاخی کے ساتھ پیش آتا ہے۔ ہر پروفیسر کی بے عزتی کرتا ہے اور آج اس نے ایک تقریب میں ہنگامہ آرائی کی اس لیے اس کو سزا دی گئی ہے۔ میں نے مزید کہا کہ ڈاکٹر صاحب ہم تمام پروفیسر آپ کے اس جذبے سے متاثر ہو کر یہاں اس جنگل میں انتہائی نامساعد حالات میں آپ سے تعاون کر رہے ہیں ورنہ ہم یہ بھی کر سکتے ہیں کہ تمام مستعفی ہو کر پیر محل میں ایک کیمپ لگا کر بیٹھ جائیں اور نہ خود کام کریں اور نہ کسی دوسرے پروفیسر کو یہاں کام کرنے دیں۔ آپ ہمارے دلی تعاون کا احترام کریں اور اس بچے کو سمجھائیں یہ اگر ایسا کرتا رہے گا تو پھر وہی ہوگا جو میں نے بتا دیا ہے اور اس طرح سے آپ کا یہ کالج تباہ ہو جائے گا۔''

میں نے جب یہ کہا تو ڈاکٹر صاحب غصے میں اُٹھے اور انہوں نے اپنے نواسے کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا:

''تو میرے گھر سے ہی میرے کالج کو تباہ و برباد کرنے پر تُلا بیٹھا ہے۔''

سارے حیران رہ گئے کہ خالد شبیر نے یہ کیا کر دیا کہ ڈاکٹر صاحب بجائے ہمیں کچھ کہنے کہ اپنے نواسے پر ہی برس پڑے۔ لڑکا تو روتے ہوئے دفتر سے باہر چلا گیا لیکن ڈاکٹر صاحب جو میرے ساتھ والی کرسی پر تشریف فرما تھے۔ انہوں نے انتہائی عاجزانہ انداز میں ایک گلہ کر دیا کہ ایک بات آپ نے اپنے منصب کے مطابق نہیں کی اس کا مجھے بڑا افسوس ہے۔ میں نے جواباً کہا کہ وہ کون سی بات ہے؟ کہنے لگے کہ میری زبان زیب نہیں دیتی کہ میں ایک ٹیچر کے بارے

میں اسے دہراؤں۔ میں سمجھ گیا کہ ڈاکٹر صاحب اب ان گالیوں کی طرف اشارہ کر رہے تھے جو میں نے اسے غصے میں دی تھیں۔ میں نے کہا کہ میں بتاؤں؟ کہنے لگے ہاں تم اپنی زبان سے کہہ دو۔

میں نے کہا کہ آپ اس بات پر افسوس کر رہے کہ میں نے اسے گالیاں دیں، مجھے بھی اس بات کا بڑی شدت کے ساتھ احساس ہے کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن ڈاکٹر صاحب آپ کے اس بچے نے کالج کے اندر حالات ہی ایسے پیدا کیے ہوئے تھے کہ مجھ جیسے صاحب اخلاق کو بھی اخلاق کا دامن چھوڑنا پڑا۔ اس پر میں نادم بھی ہوں اور معذرت خواہ بھی۔

ڈاکٹر صاحب میری اس بات پر بہت خوش ہوئے اور پھر ترنگ میں آکر کہنے لگے:

''دیکھو میں آپ تمام پروفیسروں کا ممنون بھی ہوں اور مشکور بھی ہوں۔ مجھے اس بات کا شدید احساس ہے کہ آپ بڑے مشکل حالات میں میرے ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔ لیکن میں آپ کو یہ بات بتا دوں کہ ایک دن یہ کالج ایک منفرد نوعیت کی یونیورسٹی بنے گی۔ یہاں پر ائیر پورٹ بنے اور اور بیرون ملک سے طلبا اس کالج میں داخل ہونے کے لیے آئیں گے اور یہاں پر بڑے بڑے پروفیسر ملازمت کرنے میں فخر محسوس کریں گے لیکن وہ تمام پروفیسر آپ کے ماتحت ہوں گے اور سینئر آپ ہی ہوں گے۔''

یہ کہہ کر دعائیں دیتے ڈاکٹر صاحب چلے گئے۔ پرنسپل صاحب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے کہ کیا ہونا تھا اور کیا ہو گیا۔ ہم پروفیسر اپنے ہوسٹل میں واپس آکر اس واقعہ پر کافی دیر تک گفتگو کرتے رہے اور سب نے کہا کہ خالد شبیر نے کمال کر دیا۔ میں نے کہا کہ اللہ نے مجھ سے ڈاکٹر صاحب کی دکھتی رگ کے بارے میں کہلوا دیا جس پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر کرتا ہوں۔ میرے ذہن میں تو آخری وقت تک اسے کچھ کہنے کے لیے کوئی واضح بات تھی ہی نہیں۔ اسی طرح کالج میں وقت گزرتا گیا۔ اور ہم جیسے بھی حالات تھے اس کے مطابق اپنے کام میں مصروف رہے۔ اسی ملازمت کے دوران مارچ ۱۹۶۰ء کو مجھے اپنے والد صاحب کے ایک خط کے ذریعہ یہ خوش خبری بھی ملی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے لڑکا عطا فرمایا ہے۔ اس پر دوستوں کے تقاضے کے مطابق انہیں مٹھائی بھی کھلائی گئی اور اسی مشکل حالات میں اس خوش خبری میں دو دن اچھے گزر گئے۔ اب گرمی کی چھٹیاں ہونے والی تھیں اور ہم سب بڑے خوش تھے کہ چھٹیاں گھر پر گزاریں گے۔ بستر وغیرہ باندھ رہے تھے کہ چپڑاسی نے آکر مجھے کہا کہ آپ کو پرنسپل صاحب یاد فرما رہے ہیں۔ میں بھی حیران ہوا اور ناصر شمسی بھی۔ اس نے میرے قریب آکر کہا کہ جو اس وقت بلایا گیا ہے معاملہ کچھ ٹھیک نہیں۔ لیکن یہ بات یاد رکھنا کہ اگر وہ مستعفی ہونے کے لیے کہے تو استعفیٰ نہ دینا ورنہ گرمی کی چھٹیوں کی تنخواہ سے محروم ہو جائے گا۔ میں نے کہا تم فکر نہ کرو، میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ (جاری ہے)